خاکہ

اصطلاحی معنٰی میں لفظ''خاکہ'' انگریزی لفظ اسکیچ(Sketch) کا ترجمہ ہے۔خاکے سے مراد ایک ایسی نثری تحریر ہے جس میں کسی شخصیت کی منفرد اور نمایاں خصوصیات کو اس انداز سے بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی مکمّل تصویر آنکھوں کے سامنے آجائے۔اس کے لیے خاکہ لکھنے والے کا اُس انسان کی شخصیت سے نہ صرف متاثر ہونا ضروری ہے بلکہ اُس سے واقفیت اور قربت بھی لازمی ہے۔خاکہ نگاری سوانح نگاری سے مختلف ہے۔اس میں سوانح حیات کی طرح واقعات ترتیب وار نہیں لکھے جاتے اور نہ ہی تمام حالات و واقعات کا بیان کرنا ضروری ہوتا ہے۔خاکہ نگار اسی شخصیت کا خاکہ لکھتا ہے جس سے وہ کسی نہ کسی طور پر متاثر ہوتا ہے لیکن اس کی تحریر سے مرعوبیت ظاہر نہیں ہونی چاہیے۔اُس کا بیان ایسا ہونا چاہیے کہ وہ غیر جانبدار نظر آئے۔اس لیے یہ ضروری ہے کہ خاکے میں شخصیت کی خوبیوں اور خامیوں دونوں کو بیان کیا جائے۔جس طرح خوبیوں کا بیان مرعوبیت سے پاک ہونا چاہیے اسی طرح خامیوں کے بیان میں ذاتی دشمنی وعناد کا پہلو نہیں آنا چاہیے خامیوں کے بیان میں بھی اپنائیت کا احساس نمایاں ہونا چاہیے۔

مولوی عبدالحق

(1870 – 1961)

بابائے اردو مولوی عبدالحق مغربی اتر پردیش کے قصبہ ہاپوڑ میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم وطن ہی میں حاصل کی۔1894 میں ایم۔اے۔او کالج علی گڑھ سے بی۔اے پاس کیا۔مختلف عہدوں پر فائز رہے۔انجمن ترقی اردو کے سکریٹری مقرر ہوئے اور زندگی بھر اردو زبان کی خدمت میں مصروف رہے۔انجمن کی جانب سے اُن کی ادارت میں سہ ماہی ادبی رسالہ ''اردو'' جاری ہوا۔ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں الہ آباد یونیورسٹی نے ایل ایل۔ڈی اور علی گڑھ یونیورسٹی نے ڈی۔لٹ کی اعزازی ڈگریاں دیں۔

مولوی عبدالحق محقق، سوانح نگار، خاکہ نگار، لغت نویس، ماہر قواعد اور صاحبِ طرز انشاپرداز تھے۔زبان سادہ اور پُر اثر لکھتے تھے۔انھوں نے کئی کتابیں لکھیں اور مرتب کیں۔ان کا سب سے بڑا کارنامہ دکن اور شمالی ہندوستان کے قدیم ادبی سرمائے کی بازیافت ہے۔اس طرح بہت سی بیاضیں اور رسالے ضائع ہونے سے بچ گئے۔

ہندوستان اور پاکستان میں اردو زبان کی اشاعت کے سلسلے میں مولوی عبدالحق کی خدمات بے مثال ہیں۔

5019CH10

گدڑی کا لال۔نورخاں

لوگ بادشاہوں اور امیروں کے قصیدے اور مرثیے لکھتے ہیں۔ ناموراور مشہورلوگوں کے حالات قلم بند کرتے ہیں۔ میں ایک غریب سپاہی کا حال لکھتا ہوں اس خیال سے کہ شاید کوئی پڑھے اور سمجھے کہ دولت مندوں، امیروں اور بڑے لوگوں ہی کے حالات لکھنے اور پڑھنے کے قابل نہیں ہوتے بلکہ غریبوں میں بھی بہت سے ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کی زندگی ہمارے لیے سبق آموز ہوسکتی ہے۔ انسان کا بہترین مطالعہ انسان ہے اور انسان ہونے میں امیر غریب کا کوئی فرق نہیں ہے

پھول میں گر آن ہے کانٹے میں بھی ایک شان ہے

نورخاں مرحوم کنٹنجنٹ کے اوّل رسالے میں سپاہی سے بھرتی ہوئے۔ انگریزی افواج میں حیدرآباد کی کنٹنجنٹ خاص حیثیت اور امتیاز رکھتی تھی۔ ہر شخص اس میں بھرتی نہیں ہوسکتا تھا، بہت دیکھ بھال ہوتی تھی۔ بعض اوقات نسب نامے تک دیکھے جاتے تھے تب کہیں جا کر ملازمت ملتی تھی۔ کوشش یہ ہوتی تھی کہ صرف شرفا اس میں بھرتی کیے جائیں۔ یہی وجہ تھی کہ کنٹنجنٹ والے عزّت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ لیکن بعد میں یہ قید بھی اُٹھ گئی اور اس میں اور انگریزوں کی دوسری فوجوں میں کوئی فرق نہ رہا۔ پہلے زمانے میں سپاہ گری بہت معزّز پیشہ سمجھا جاتا تھا۔ اب اس میں اور دوسرے پیشوں میں کوئی فرق نہیں رہا۔ بات یہ ہے کہ اشراف کا سنبھالنا مشکل کام ہے۔ اس میں ایک آن بان اور خودداری ہوتی ہے جو بہادری اور انسانیت کا اصل جوہر ہے، ہر کوئی اس کی قدر نہیں کرسکتا۔ اس لیے شریف روتا اور ذلیل ہنستا ہے۔ یہ جتنا پھیلتا ہے وہ اتنا ہی سکڑتا ہے۔ کرنل نواب افسرالملک بہادر بھی نورخاں مرحوم ہی کے رسالے کے ہیں۔ کنٹنجنٹ کے بہت سے لوگ اکثر تو کرنل صاحب موصوف کے توسّط سے اور بعض اور ذرائع سے حیدرآباد ریاست میں آکر ملازم ہوگئے۔ ان میں بہت سے نواب، کرنل، میجر، کپتان اور بڑے بڑے عہدے دار ہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کوئی نورخاں بھی ہے؟

اوّل رسالے کے بعض لوگوں سے معلوم ہوا کہ خان صاحب مرحوم فوج میں بھی بڑی آن بان سے رہے اور سچائی اور فرض

شناسی میں مشہور تھے۔ یہ ڈرل اِنسٹرکٹر تھے یعنی گوروں کو جو نئے بھرتی ہوکر آتے تھے ڈرل سکھاتے تھے۔اس لیے اکثر گورے افسروں سے واقف تھے۔وہ بڑے شہسوار تھے۔گھوڑے کوخوب پہچانتے تھے۔ بڑے بڑے سرکش گھوڑے جو پٹھے پر ہاتھ نہ دھرنے دیتے تھے، انھوں نے درست کیے۔گھوڑے کے سدھانے اور پھیرنے میں اُنھیں کمال تھا۔ چوں کہ بدن کے چھریرے اور ہلکے پھلکے تھے، گھُڑ دوڑوں میں گھوڑے دوڑاتے تھے اور اکثر شرطیں جیتتے تھے۔اُن کے افسر اُن کی مستعدی، خوش تدبیری اور سلیقے سے بہت خوش تھے لیکن کھرے پن سے وہ اکثر اوقات ناراض ہوجاتے تھے۔ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ان کے کمانڈنگ افسر نے کسی بات پر خفا ہوکر جیسا کہ انگریزوں کا عام قاعدہ ہے انھیں 'ڈیم' کہہ دیا۔ یہ تو گالی تھی، خاں صاحب کسی کی ترچھی نظر کے بھی روادار نہ تھے۔انھوں نے فوراً رپورٹ کردی۔لوگوں نے چاہا کہ معاملہ رفع دفع ہوجائے اور آگے نہ بڑھے، مگر خاں صاحب نے ایک نہ سُنی۔ معاملے نے طول کھینچا اور جنرل صاحب کولکھا گیا۔کمانڈنگ افسر کا کورٹ مارشل ہوا اور اُس سے کہا گیا کہ خان صاحب سے معافی مانگے۔ ہر چند اُس نے بچنا چاہا مگر پیش نہ گئی اور مجبوراً اُسے معافی مانگنی پڑی۔ایسی خودداری اور نازک مزاجی پر ترقی کی توقع رکھنا عبث ہے۔نتیجہ یہ ہوا کہ دفعداری سے آگے نہ بڑھے۔

اچھے بُرے ہر قوم میں ہوتے ہیں۔شریف افسر خاں صاحب کی سچائی، دیانت اور جفاکشی کی بہت قدر کرتے تھے اور اُن کو اپنی اردلی میں رکھتے تھے۔مگر بعض ایسے بھی تھے جن کے سر میں خنّاس سمایا ہوا تھا، انھیں خاں صاحب کے یہ ڈھنگ پسند نہ تھے اور وہ ہمیشہ ان کے نقصان کے درپے رہتے تھے۔ایسے لوگ اپنی اور اپنی قوم والوں کی خوداری کو تو جوہرِ شرافت سمجھتے ہیں لیکن اگر یہی جوہر کسی دیسی میں ہوتا ہے تو اُسے غرور اور گستاخی پر محمول کرتے ہیں۔تاہم اُن کے بعض انگریزی افسر اُن پر بہت مہربان تھے۔خاص کر کرنل فرن ٹین اُن پر بڑی عنایت کرتے تھے اور خاں صاحب پر اس قدر اعتبار تھا کہ شاید کسی اور پر ہو۔ جب کرنل صاحب نے اپنی خدمت سے استعفا دیا تو اپنا تمام مال و اسباب اور سامان جو ہزارہا روپے کا تھا، خاں صاحب کے سپرد کر گئے۔ یہ امر انگریز افسروں کو بہت ناگوار ہوا۔اس وقت کے کمانڈنگ افسر سے نہ رہا گیا اور اس نے کرنل موصوف کو خط لکھا کہ آپ نے ہم پر اعتماد نہ کیا اور ایک دیسی دفعدار کو اپنا تمام قیمتی سامان حوالے کر گئے۔اگر آپ یہ سامان ہمارے سپرد کر جاتے تو اسے اچھے داموں میں فروخت کرکے قیمت آپ کے پاس بھیج دیتے۔اب بھی اگر آپ لکھیں تو اس کا انتظام ہوسکتا ہے۔کرنل نے جواب دیا کہ مجھے نور خاں پر تمام انگریز افسروں سے زیادہ اعتماد ہے، آپ کو زحمت کرنے کی ضرورت نہیں۔اس پر یہ لوگ اور برہم ہوئے۔

ایک بار کمانڈنگ افسر یہ سامان دیکھنے آیا اور کہنے لگا کہ فلاں فلاں چیز میم صاحب نے ہمارے ہاں سے منگائی تھی، چلتے

وقت واپس کرنی بھول گئے، اب تم یہ سب چیزیں ہمارے بنگلے پر بھیج دو۔ خاں صاحب نے کہا میں ایک چیز بھی نہیں دوں گا، آپ کرنل صاحب کو لکھیے وہ اگر مجھے لکھیں گے تو مجھے دینے میں کچھ عذر نہ ہوگا۔ وہ اس جواب پر بہت بگڑا اور کہنے لگا تم ہمیں جھوٹا سمجھتے ہو؟ خاں صاحب نے کہا میں آپ کو جھوٹا نہیں سمجھتا، یہ سامان میرے پاس امانت ہے اور میں کسی کو اس میں سے ایک تنکا بھی دینے کا مجاز نہیں۔ غرض وہ بڑبڑاتا ہوا کھسیانا ہوکر چلا گیا۔ خاں صاحب نے ایک انگریزی محرّر سے اس سامان کی مکمل فہرست تیار کرائی اور کچھ تو خود خرید کر کچھ نیلام کے ذریعے بیچ کر ساری رقم کرنل صاحب کو بھیج دی۔

نہ معلوم یہی کرنل تھا یا کوئی دوسرا افسر، جب ملازمت سے قطع تعلق کر کے جانے لگا تو اس نے ایک سونے کی گھڑی، ایک عمدہ بندوق اور پانسو روپے نقد خاں صاحب کو بطور انعام یا شکرانے کے دیے۔ خاں صاحب نے لینے سے انکار کیا، کرنل اور اس کی بیوی نے بہتیرا اصرار کیا مگر انھوں نے سوائے ایک بندوق کے دوسری چیز نہ لی اور باقی سب چیزیں واپس کر دیں۔

کرنل اسٹوارٹ بھی جو ہنگولی چھاؤنی کے افسر، کمانڈنگ افسر تھے، اُن پر بہت مہربان تھے۔ رسالے کے شریف انگریز ان سے کہا کرتے تھے کہ ہمارے بعد انگریز افسر تم کو بہت نقصان پہنچائیں گے۔ وہ ان کی روش سے خوش نہ تھے اور خوش کیوں کر ہوتے، خوشامد سے انھیں چڑتھی اور غُلامانہ اطاعت آتی نہیں تھی۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ اپنے کرنل کے ہاں کھڑے تھے کہ ایک انگریز افسر گھوڑے پر سوار آیا، گھوڑے سے اُتر کر اس نے خاں صاحب سے کہا کہ گھوڑا پکڑو۔ انھوں نے کہا، ''میں سائیس نہیں ہوں۔'' اس نے ایسا جواب کاہے کو سنا تھا، بہت چیں بہ جبیں ہوا مگر کیا کرتا، آخر باگ درخت کی ایک شاخ سے اٹکا کر اندر چلا گیا۔ اب نہ معلوم یہ خاں صاحب کی شرارت تھی یا اتفاق تھا کہ باگ شاخ میں سے نکل گئی اور گھوڑا بھاگ نکلا۔ اب جو صاحب باہر آئے تو گھوڑا ندارد۔ بہت جھنجھلایا، بڑی مشکل سے تلاش کر کے پکڑوایا تو جگہ جگہ سے زخمی پایا۔ اس نے کرنل صاحب سے خاں صاحب کی بہت شکایت کی۔ معلوم نہیں کرنل نے اس انگریز کو کیا جواب دیا لیکن وہ خاں صاحب سے بہت خوش ہوا اور کہا کہ تم نے خوب کیا۔

خاں صاحب نے جب یہ رنگ دیکھا تو خیر اسی میں دیکھی کہ کسی طرح وظیفہ لے کر الگ ہو جائیں۔ وہ بیمار بن گئے اور ہسپتال میں رجوع ہوئے۔ کرنل اسٹوارٹ نے ڈاکٹر سے کہہ کر ان کو مدد دی اور اس طرح وہ کچھ دنوں بعد ڈاکٹر کی رپورٹ پر وظیفہ لے کر فوجی ملازمت سے سبک دوش ہو گئے۔ سچ ہے انسان کی برائیاں ہی اس کی تباہی کا باعث نہیں ہوتیں بعض وقت اس کی خوبیاں بھی اسے لے ڈوبتی ہیں۔

کرنل اسٹوارٹ نے بہت چاہا کہ وہ مسٹر ہنکن ناظم پولیس سے سفارش کر کے انھیں ایک اچھا عہدہ دلا دیں مگر خاں

صاحب نے اسے قبول نہ کیا اور کہا کہ میں اب اپنے وطن دولت آباد ہی میں رہنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ صوبے دار صاحب اورنگ آباد سے سفارش فرما دیں تو بہت اچھا ہو۔ کرنل صاحب بہت اصرار کرتے رہے کہ دیکھو تمھیں پولیس میں بہت اچھی خدمت مل جائے گی انکار نہ کرو مگر یہ نہ مانے۔ آخر مجبور ہو کر نواب مقتدر جنگ بہادر صوبے دار صوبہ اورنگ آباد سے سفارش کی۔ صوبے دار صاحب کی عنایت سے وہ قلعۂ دولت آباد کی جمعیت کے جمعدار ہو گئے اور بہت خوش تھے۔

نواب مقتدر جنگ کے بعد نواب بشیر نواز جنگ اورنگ آباد کی صوبے داری پر آئے۔ وہ بھی خاں صاحب پر بہت مہربان تھے۔ اسی زمانے میں لارڈ کرزن وائسرائے دولت آباد تشریف لائے۔ خاں صاحب نے سلامی دینے کی تیاری کی۔ کئی توپیں ساتھ ساتھ رکھ کر سلامی دینی شروع کی۔ لارڈ کرزن گھڑی نکال کر دیکھ رہے تھے۔ جب سلامی ختم ہوئی تو نواب صاحب سے خاں صاحب کی تعریف کی۔ سلامی ایسے قاعدے اور اندازے سے دی کہ ایک سکنڈ کا فرق نہ ہونے پایا۔ نواب صاحب نے اس کا تذکرہ خاں صاحب سے کیا اور کہا کہ میاں اب تمھاری خیر نہیں معلوم ہوتی۔

لارڈ کرزن جب قلعہ کے اوپر بالا حصار پر گئے تو وہاں ستانے کے لیے کرسی پر بیٹھ گئے اور جیب سے سگرٹ دان نکال کر سگرٹ پینا چاہا۔ دِیا سلائی نکال کر سگرٹ سلگایا ہی تھا کہ یہ فوجی سلام کر کے آگے بڑھا اور کہا کہ یہاں سگرٹ پینے کی اجازت نہیں ہے۔ لارڈ کرزن نے جلتا ہوا سگرٹ نیچے پھینک دیا اور جوتے سے رگڑ ڈالا۔ یہ حرکت دیکھ کر نواب بشیر نواز جنگ بہادر اور دوسرے عہدے داروں کا رنگ فق ہو گیا۔ مگر موقع ایسا تھا کہ کچھ کہہ نہیں سکتے تھے، لہو کے سے گھونٹ پی کر چپ رہ گئے۔ بعد میں بہت کچھ لے دے کی مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ خاں صاحب نے قاعدے کی پوری پابندی کی تھی، اس میں چوں وچرا کی گنجائش نہ تھی۔

اب اسے اتفاق کہیے یا خاں صاحب کی تقدیر کہ لارڈ کرزن نے جانے کے بعد ہی فنانس کی معتمدی کے لیے مسٹر واکر کا انتخاب کیا۔ ریاست کے مالیے کی حالت اس زمانے میں بہت خراب تھی۔ مسٹر واکر نے اصلاحیں شروع کیں۔ اس لپیٹ میں قلعۂ دولت آباد بھی آ گیا، اوروں کے ساتھ خاں صاحب بھی تخفیف میں آ گئے۔

دولت آباد میں ان کی کچھ زمین تھی، اس میں باغ لگانا شروع کر دیا۔ مسٹر واکر دورے پر دولت آباد آئے تو ایک روز ٹہلتے ٹہلتے ان کے باغ میں بھی آ پہنچے۔ خاں صاحب بیٹھے گھاس کھُرپ رہے تھے۔ مسٹر واکر کو آتے دیکھا تو اُٹھ کر سلام کیا۔ پوچھا کیا حال ہے، کہنے لگے آپ کی جان و مال کو دُعا دیتا ہوں۔ اب آپ کی بدولت گھاس کھودنے کی نوبت آ گئی۔ مسٹر واکر نے کہا یہ اچھا کام ہے۔ دیکھو تمھارے درخت انجیروں سے کیسے لدے ہوئے ہیں۔ ایک ایک آنے کو بھی ایک ایک انجیر بیچو تو کتنی آمدنی ہو جائے

گی۔خاں صاحب گھبرائے کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ کم بخت انجیروں پر بھی ٹیکس لگا دے۔تڑ سے جواب دیا کہ آپ نے انجیر لدے ہوئے تو دیکھ لیے اور یہ نہ دیکھا کہ کتنے سڑگل کر گر جاتے ہیں۔کتنے آندھی ہوا سے گر پڑتے ہیں، کتنے پرند کھا جاتے ہیں اور پھر ہماری دِن رات کی محنت۔مسٹر واکر مسکراتے ہوئے چلے گئے۔

اسی زمانے میں ڈاکٹر سید سراج الحسن صاحب اورنگ آباد کے صدر مہتمم تعلیمات ہوکر آئے تھے۔ڈاکٹر صاحب بلا کے مردم شناس ہیں۔تھوڑی ہی دیر میں اور چند ہی باتوں میں آدمی کو ایسا پرکھ لیتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔پھر جیسا وہ آدمی کو سمجھتے ہیں ویسا ہی نکلتا ہے۔کبھی خطا ہوتے نہیں دیکھی۔ڈاکٹر صاحب ایسے قابل جوہروں کی تلاش میں رہتے ہیں،فوراً ہی اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔ڈاکٹر صاحب کا برتاؤ ان سے بہت شریفانہ اور دوستانہ تھا۔نواب برزور جنگ اس زمانے میں صوبے دار تھے۔مقبرے کا باغ ان کی نگرانی میں تھا۔ڈاکٹر صاحب نے سفارش کرکے باغ سے پانچ روپے ماہانہ الونس (الاؤنس) مقرّر کرا دیا۔

نواب برزور جنگ کے پاس ایک گھوڑا تھا، وہ اسے بیچنا چاہتے تھے۔کلب میں کہیں اس کا ذکر آیا۔ڈاکٹر صاحب نے کہا مجھے گھوڑے کی ضرورت ہے۔میں اُسے خرید لوں گا مگر پہلے نورخاں کو دکھالوں۔وہاں سے آکر ڈاکٹر صاحب نے خاں صاحب سے یہ واقعہ بیان کیا اور کہا کہ بھئی اُس گھوڑے کو دیکھ آؤ کوئی عیب تو نہیں۔خاں صاحب نے کہا آپ نے غضب کیا میرا نام لے دیا۔گھوڑے میں کوئی عیب ہوا تو میں چھپاؤں گا نہیں اور صوبے دار صاحب مفت میں مجھ سے ناراض ہو جائیں گے۔ڈاکٹر صاحب نے کہا تم خواہ مخواہ وہم کرتے ہو،کل جاکے ضرور گھوڑا دیکھ لو۔خاں صاحب گئے۔گھوڑا نسل کا تو اچھا تھا مگر پانچوں شرعی عیب موجود تھے۔انھوں نے صاف صاف آکے کہہ دیا اور ڈاکٹر صاحب نے خریدنے سے اِنکار کر دیا۔صوبے دار صاحب آگ بگولا ہوگئے۔دوسرے روز مقبرے میں آئے۔باغ کا رجسٹر منگایا اور نورخاں کے نام پر اس زور سے قلم کھینچا کہ اگر لفظوں میں جان ہوتی تو وہ بلبلا اُٹھتے۔ڈاکٹر صاحب کو معلوم ہوا تو بہت افسوس کیا مگر انھوں نے اس کی تلافی کر دی۔یہ سن کر صوبے دار صاحب اور بھی جھنجھلائے۔

ڈاکٹر صاحب ترقی پا کر حیدرآباد چلے گئے۔اُن کی خدمت کا دوسرا انتظام ہوگیا۔کچھ دنوں بعد ڈاکٹر صاحب ناظم تعلیمات ہوگئے اور میں ان کی عنایت سے صدر مہتمم تعلیمات ہوکر اورنگ آباد آیا۔ڈاکٹر صاحب ہی نے مجھے نورخاں سے ملایا اور ان کی سفارش کی۔ڈاکٹر صاحب نے انھیں عارضی طور پر دولت آباد میں مدرّس کر دیا تھا، میں نے عارضی طور پر اپنے دفتر میں محرّر کر دیا، وہ مدرّسی اور محرّری تو کیا کرتے مگر بہت سے مدرّسوں اور محرّروں سے زیادہ کارآمد تھے۔ڈاکٹر صاحب نے جب باغ کی نگرانی میرے حوالے کی تو خاں صاحب کا الونس بھی جاری ہوگیا۔

اعلا حضرت واقدس بعد تخت نشینی اورنگ آباد رونق افروز ہوئے تو یہاں کی خوش آب وہوا کو بہت پسند فرمایا اور عظیم الشان باغ لگانے کا حکم دیا۔ یہ کام ڈاکٹر صاحب کے سپرد ہوا اور ان سے بہتر کوئی یہ کام کر بھی نہیں سکتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی مہربانی سے آخر اس باغ کے عملے میں خاں صاحب کو بھی ایک اچھی سی جگہ مل گئی جو اُن کی طبیعت کے مناسب تھی اور آخر دم تک وہ اسی خدمت پر رہے۔ اور جب تک دم میں دم رہا، اپنے کام کو بڑی محنت اور دیانت سے کرتے رہے۔

یوں محنت سے کام تو اور بھی کرتے ہیں لیکن خاں صاحب میں بعض ایسی خوبیاں تھیں جو بڑے بڑے لوگوں میں بھی نہیں ہوتیں۔ سچائی بات کی اور معاملے کی اُن کی سرشت میں تھی۔ خواہ جان ہی پر کیوں نہ بن جائے وہ سچ کہنے سے کبھی نہیں چوکتے تھے۔ اس میں انھیں نقصان بھی اُٹھانے پڑے مگر وہ سچائی کی خاطر سب کچھ گوارا کر لیتے تھے۔ مستعد ایسے تھے کہ اچھے اچھے جوان اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ دن ہو، رات ہو، ہر وقت کام کرنے کے لیے تیار۔ اکثر دولت آباد سے پیدل آتے جاتے تھے۔ کسی کام کو کہیے تو ایسی خوشی خوشی کرتے تھے کہ کوئی اپنا کام بھی اس قدر خوشی سے نہ کرتا ہوگا۔ دوستی کے بڑے پکّے اور بڑے وضع دار تھے۔ چونکہ ادنا اعلا سب اُن کی عزّت کرتے تھے اس لیے اُن سے غریب دوستوں کے بہت سے کام نکلتے تھے۔ اُن کا گھر مہمان سرائے تھا۔ اورنگ آباد کے آنے جانے والے کھانے کے وقت بے تکلف اُن کے گھر پہنچ جاتے اور وہ اس سے بہت خوش ہوتے تھے۔ بعض لوگ جو مسافر بنگلے میں آکر ٹھہر جاتے تھے ان کی بھی دعوت کر دیتے تھے۔ بعض اوقات ٹولیوں کی ٹولیاں پہنچ جاتی تھیں اور وہ ان کی دعوتیں بڑی فیاضی سے کرتے تھے۔ اس قدر قلیل معاش ہونے پر ان کی یہ مہمان نوازی دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ اُن کی بیوی بھی ایسی نیک بخت تھی کہ دفعتاً مہمانوں کے پہنچ جانے سے کبیدہ خاطر نہ ہوتی تھی بلکہ خوشی خوشی کام کرتی اور کھلاتی تھی۔ خوددار ایسے تھے کہ کسی سے ایک پیسے کا روادار نہ ہوتے تھے۔ ڈاکٹر سراج الحسن ہر چند طرح طرح سے اُن کے ساتھ سلوک کرنا چاہتے تھے مگر وہ ٹال جاتے تھے۔ مجھ سے انھیں خاص اُنس تھا۔ میں کوئی چیز دیتا تو کبھی انکار نہ کرتے بلکہ کبھی کبھی خود فرمائش کرتے تھے۔ مٹھاس کے بے حد شائق تھے۔ اُن کا قول تھا کہ اگر کسی کو کھانے کو میٹھا ملے تو نمکین کیوں کھائے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ''نمکین کھانا مجبوری سے کھاتا ہوں، مجھ میں اگر استطاعت ہو تو ہمیشہ مٹھاس ہی کھایا کروں اور نمکین کو ہاتھ نہ لگاؤں۔'' انھیں مٹھاس کھاتے دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ اکثر جیب میں گُڑ رکھتے تھے۔ ایک بار میرے ساتھ دعوت میں گئے، قسم قسم کے تکلّف کے کھانے تھے۔ خاں صاحب نے چھوٹتے ہی میٹھے پر ہاتھ ڈالا۔ ایک صاحب جو دعوت میں شریک تھے یہ خیال کر کے کہ خاں صاحب کو دھوکا ہوا ہے کہنے لگے کہ ''حضرت یہ میٹھا ہے۔'' مگر انھوں نے کچھ پروا نہ کی اور برابر کھاتے رہے۔ جب وہ ختم ہو گیا تو دوسرے میٹھے پر ہاتھ بڑھایا۔ ان صاحب نے پھر ٹوکا کہ حضرت یہ میٹھا ہے، انھوں نے کچھ جواب نہ دیا اور اسے بھی ختم کر ڈالا۔ جب کبھی وہ کسی

دوست کے ہاں جاتے تو وہ اُنھیں ضرور میٹھا کھلاتے اور یہ خوش ہو کر کھاتے۔

خاں صاحب بہت زندہ دل تھے، چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ رہتی تھی جسے دیکھ کر خوشی ہوتی تھی۔ وہ بچوں میں بچے، جوانوں میں جوان اور بوڑھوں میں بوڑھے تھے۔ غم اور فکر کو پاس نہ آنے دیتے تھے اور ہمیشہ خوش رہتے تھے اور دوسروں کو بھی خوش رکھتے تھے۔ ان سے ملنے اور باتیں کرنے سے غم غلط ہوتا تھا۔ آخر دم تک ان کی زندہ دلی ویسی ہی رہی۔

ڈاکٹر سراج الحسن صاحب جب کبھی اورنگ آباد آتے تو اسٹیشن سے اُترتے ہی اپنا روپیہ پیسہ سب اُن کے حوالے کر دیتے اور سب خرچ انھیں کے ہاتھ سے ہوتا تھا۔ جانے سے پہلے ایک روز قبل وہ حساب لے کے بیٹھتے، بعض وقت جب بِدہ نہ ملتی تو آدھی آدھی رات تک لیے بیٹھے رہتے تھے۔ ہر چند ڈاکٹر صاحب کہتے کہ خاں صاحب یہ تم کیا کرتے ہو، جو خرچ ہوا ہوا، باقی جو بچا وہ دے دیا یا زیادہ خرچ ہوا ہو تو لے لیا۔ مگر وہ کہاں مانتے تھے، جب تک حساب ٹھیک نہ بیٹھتا انھیں اطمینان نہ ہوتا۔ چلتے وقت کہتے کہ لیجیے صاحب یہ آپ کا حساب ہے، اتنا خرچ ہوا اور اتنا بچا۔ یا کچھ زیادہ خرچ ہو جاتا تو کہتے کہ اتنے پیسے ہمارے خرچ ہوئے ہیں یہ ہمیں دلوائیے۔ کبھی ایسا ہوا کہ انھیں کچھ شبہ ہوا تو جانے کے بعد پھر حساب لے کے بیٹھتے اور خط لکھ کر بھیجتے کہ اتنے آنے آپ کے رہ گئے تھے وہ بھیجے جاتے ہیں یا اتنے پیسے میرے زیادہ خرچ ہو گئے تھے وہ بھیج دیجیے گا۔ ڈاکٹر صاحب ان باتوں پر بہت جھنجھلاتے تھے مگر وہ اپنی وضع نہ چھوڑتے تھے۔

وہ حساب کے کھرے، بات کے کھرے اور دل کے کھرے تھے۔ وہ مہر و وفا کے پتلے اور زندہ دلی کی تصویر تھے۔ ایسے نیک نفس، ہم درد، مرنج و مرنجان اور وضع دار لوگ کہاں ہوتے ہیں۔ اُن کے بڑھاپے پر جوانوں کو رشک آتا تھا اور ان کی مستعدی کو دیکھ کر دل میں اُمنگ پیدا ہوتی تھی۔ ان کی زندگی بے لوث تھی اور اُن کی زندگی کا ہر لمحہ کسی نہ کسی کام میں صرف ہوتا تھا۔ مجھے وہ اکثر یاد آتے ہیں اور یہی حال ان کے دوسرے جاننے والوں اور دوستوں کا ہے۔ اور یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ وہ کیسا اچھا آدمی تھا۔ قومیں ایسے ہی لوگوں سے بنتی ہیں۔ کاش ہم میں بہت سے نور خاں ہوتے!

____ مولوی عبدالحق

سوالوں کے جواب لکھیے :

1۔ مصنف نے نورخاں کو گدڑی کا لال کیوں کہا ہے؟

2۔ نورخاں نے کمانڈرنگ آفیسر کی رپورٹ کیوں کی اور اس کا کیا اثر ہوا؟

3۔ نورخاں کی فرض شناسی کے کسی ایک واقعے کو اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

4۔ ''قومیں ایسے ہی لوگوں سے بنتی ہیں'' اس جملے کی وضاحت کیجیے۔